مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

امام العصر، محدّث جلیل
حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرّہ
احوال وخدمات اور کمالات کی ایک جھلک

برصغیر ہند کی گذشتہ تقریباً سوا سو سال کی دینی علمی تحریک جن اکابر علماء کی ممنون کرام اور خصوصاً تعلیمات ولی اللّٰہی کا گلستاں جن کی خدمات سے سرسبز وشاداب ہے، نیز دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور اور ان سے متعلق مدرسے اور علماء جس شجر پر بہار کی شاخیں ہیں اس میں ایک بہت ہی ممتاز اور برگزیدہ نام محدث عصر، فقیہ جلیل، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعہ کا ہے۔ اور بلا تأمل کہا جا سکتا ہے کہ دار العلوم دیوبند اور مدارس اسلامیہ کی تأسیس کی جو روایت قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قائم کی تھی، اس کی سب سے زیادہ آبیاری اور سرپرستی حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ہی فرمائی، ان مدارس کے ذریعہ سے علم وکمال اور خدمت قرآن وحدیث اور فقہ وشریعت کا جو دریا جاری ہوا اور اتباع دین وشریعت کی جو فضائیں اور اس کی جو باد بہاری چلی اس میں بھی حضرت والا کے رسوخ فی العلم اور دعوت واتباع سنت کے گہرے اثرات صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا کی ذات گرامی اپنے آپ میں ایک بڑا مرکز علم، بڑا ادارہ اور دار العلوم تھی، جس میں علم وتدریس کا سلسلہ بھی تھا اور تربیت باطن کی فکر بھی، قدم قدم اتباع سنت کا ذکر اور رسومات وبدعات کی بیخ کنی کا اہتمام تھا۔ اور خانوادۂ ولی اللّٰہی کے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کی کوششوں سے جو ایک دنیائے علم وعمل آباد ہوئی تھی، جب اس کی آبادیوں میں شکست وریخت کے کچھ آثار ظاہر ہوئے تو حضرت مولانا گنگوہیؒ کی توجہ، محنت اور کوششوں سے اس کی تجدید وتزئین ہوئی اور یوں اس روایت کا تسلسل جاری رہا۔

وطن:

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اس خانوادے کے ایک فرد ہیں جس کا آبائی وطن رامپور ضلع سہارنپور تھا، اس خاندان کا ایک گھرانہ رام پور سے سہارنپور منتقل ہو گیا تھا، اسی میں حضرت گنگوہی تولد ہوئے [1]۔

خاندان

چھٹی صدی ہجری میں پیر ہرات حضرت شیخ عبداللہ انصاری (وفات: ۴۸۱ھ، ۱۰۸۹ء) کے پوتے شیخ جلال الدین بن شیخ سلیم بن محمد اسماعیل بن شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہندوستان آئے اور میرٹھ کے نواح میں واقع ایک پر رونق اور آباد بستی سرسل ۲ میں آباد ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد و اخلاف میں بہت برکت عطا فرمائی اور اس وقت یوپی میں قدیم انصاری خاندان اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد کی جس قدر بھی شاخیں ہیں، وہ سب انہی کی اولاد میں ہیں، پانی پت اور نواح اضلاع سہارنپور وغیرہ کے انصاری خاندان بھی اسی سے وابستہ ہیں، اپنے نصاب تعلیم کے لیے شہرۂ آفاق شخصیت، علامہ نظام الدین سہالوی اور فرنگی محل کے علماء بھی اسی شجر کی پر بہار شاخیں ہیں [۳]۔

اجداد

اسی خاندان کے چند افراد موضع برناوہ سے رام پور منیہاران ضلع سہارنپور چلے گئے تھے، بعد میں اسی گھرانہ کی ایک شاخ رامپور سے نواحی بستی گنگوہ منتقل ہوئی، حضرت مولانا گنگوہیؒ کا خاندان اور بزرگ بھی اسی میں سے ہیں، مولانا کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔

''حضرت مولانا رشید احمد بن مولانا ہدایت احمد بن قاضی پیر بخش بن قاضی غلام حسن بن قاضی غلام علی بن قاضی علی اکبر بن قاضی محمد اسلم انصاری'' [۵]۔

مولانا کے خاندان میں علم کی روایت اور اس کے اثرات قدیم تھے، حضرت مولانا کے والد ماجد ہدایت احمد کی تقریباً ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۰ء) میں ولادت ہوئی، عالم اور صاحب کمال تھے، خانوادہ حضرت شاہ ولی اللہ کے علماء (غالباً حضرت شاہ محمد اسحاقؒ؟) سے تعلیم حاصل کی اور اس عہد کے جلیل القدر شیخ شاہ غلام علی (وفات ۱۲۴۰ھ) سے بیعت ہوئے اور خلافت و اجازت سے نوازے گئے، علم اور کتابوں کے شائق تھے، کثرت سے کتابیں نقل کیا کرتے تھے، مولانا ہدایت احمد کی ساڑھے پینتیس سال کی عمر میں جمادی الآخر ۱۲۵۲ھ (ستمبر، اکتوبر ۱۸۳۵ء) میں گورکھپور میں وفات ہوئی [۶]۔

مولانا ہدایت احمد کے تین بیٹے اور دو لڑکیاں تھیں، مولوی عنایت احمد، حضرت مولانا رشید احمد اور سعید احمد، مؤخر الذکر کم سنی میں نو سال کی عمر میں فوت ہو گئے تھے، مولوی عنایت احمد حضرت مولانا سے بڑے تھے اور مولانا نے ان سے ابتدائی چند کتابیں بھی پڑھی تھیں۔

ولادت

حضرت مولانا، ۶ رذیقعدہ ۱۲۴۴ھ (۱۱ رمئی ۱۸۲۹ء) کو دوشنبہ کے دن گنگوہ میں پیدا ہوئے، سات سال کی عمر تھی کہ والد صاحب رحلت کر گئے، دادا اور ماموں نے پرورش اور ہر طرح کی سرپرستی فرمائی اور تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر انتظام کیا۔

تعلیم، آغاز سے تکمیل تک

دینی گھرانوں اور شرفاء کے معمول کے مطابق سب سے پہلے قرآن شریف کی تعلیم پر توجہ کی گئی، ایک مقامی معلم حافظ قطب بخش گنگوہی سے تعلیم کا آغاز ہوا، چونکہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اس لئے والدہ کے ساتھ اپنے چھوٹے ماموں مولوی محمد تقی صاحب گنگوہی سے کرنال میں رہ کر فارسی پڑھی، فارسی کی چند کتابیں مولوی محمد غوث گنگوہی سے پڑھیں [۷]۔

فارسی کے بعد عربی کی ابتدائی کتابیں شروع ہوئیں، عربی کی تعلیم اپنے آبائی وطن رامپور کے ایک برگزیدہ شخص اور فاضل مولانا محمد حسن (عرف محمد بخش) رامپوری [۸] سے حاصل کی، مولانا محمد حسن نے ہدایۃ النحو پڑھانے کے بعد ہدایت کی کہ اور کتابوں کے لیے دہلی جانا چاہیے، مولانا محمد بخش (حسن) صاحب بھی دہلی میں تعلیم پائے ہوئے تھے، اس لیے مولانا کے ساتھ دہلی آنا ہوا، اس وقت حضرت مولانا مملوک العلی دہلی کالج میں استاذ اور مرجع العلماء تھے (اور اطراف سہارنپور کے علاوہ دہلی کے ممتاز علماء اور نامور اصحاب درس میں سے شمار ہوتے تھے) مگر مولانا گنگوہی کو حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی کی بے پناہ مصروفیت اور وقت کے فقدان کی وجہ سے مولانا کے حلقۂ درس میں جلد داخلہ نہیں ملا، اس میں خاصا وقت غالباً کئی مہینے لگے تھے، مولانا گنگوہیؒ نے اس درمیان اور علماء سے پڑھا، حضرت مولانا کے حوالہ سے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے نقل کیا ہے کہ:

> ''ابتداء ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی، کہیں سبق تھوڑا ہوتا تھا، کہیں شبہات کا جواب نہ ملتا تھا، مگر جب مولانا مملوک العلی صاحبؒ کی خدمت میں پہونچے تو ہمیں اطمینان ہوگیا، اور بہت تھوڑے عرصہ میں کتابیں ختم کرلیں۔'' [۹]

ان اساتذہ کی فہرست میں سب سے پہلا نام اس وقت کے ایک مدرس مولانا احمد الدین پنجابی [۱۰] کا ہے، مولانا احمد الدین سے غالباً ہدایۃ النحو سے متوسطات تک پڑھنے کا موقع ملا، دہلی کے ایک اور جلیل القدر اور سلسلۂ مجددیہ کے شیخ شاہ احمد سعید مجددی سے بھی تلمذ تھا، ایک اور استاذ مولانا کریم بخش پنجابی تھے [۱۱]، حضرت مولانا کے اساتذہ میں ایک اور اہم نام مولانا مفتی صدر الدین آزردہ کا ہے جو دہلی کی بزم علم کے گویا صدر نشین اور مرجع کل تھے، مگر مذکورہ بزرگوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کی علمی ترقیات اور تعلیم و تربیت میں سب سے بڑا حصہ استاذ العلماء حضرت مولانا مملوک العلی نانوتویؒ کا ہے، اگرچہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کو مولانا نانوتوی کی خدمت میں حاضری کا دیر سے موقع ملا مگر مولانا کے اسباق میں پہونچ کر اندازہ بلکہ یہ تجربہ ہوا کہ مولانا مملوک العلی کی درسگاہ بعض حیثیتوں سے علمائے دہلی کے حلقوں سے مختلف ہے، مولانا اس طرح پڑھاتے ہیں جیسے گھول کر پلادیا، حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے۔

> ''مگر جب مولانا مملوک العلی صاحبؒ کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہوگیا اور بہت تھوڑے عرصہ میں کتابیں ختم کرلیں، گویا استاذ نے گھول کر پلادیا، فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ میں اچھے اچھے

استاذ دہلی میں موجود تھے مگر ایسے استاذ کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو اور انواع مختلفہ سے تقریر کر کے شاگرد کے ذہن نشیں کر دیں ایک ہمارے استاذ مولانا مملوک العلی صاحب، دوسرے ہمارے استاذ مفتی صدر الدین آزردہ تھے [۱۲]

حضرت مولانا مملوک العلی سے کیا کیا کتابیں پڑھیں اور دوسرے اساتذہ کی خدمت میں کن کتابوں کا درس لیا، اس کی تفصیل دریافت نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ مولانا گنگوہی کی تعلیم کے علاوہ مولانا کے فکر و مزاج کی تشکیل میں بھی حضرت مولانا مملوک العلی کا بہت بڑا اور اہم حصہ ہے۔

حضرت مولانا مملوک العلی کی خدمت میں درسیات اور معقولات کی تکمیل کے بعد درس حدیث کے لیے دہلی کے نامور محدث، حضرت مولانا شاہ عبد الغنی مجددی کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوئے اور صحاح ستہ کا درس لیا ور اجازت حدیث حاصل کی، دہلی میں حضرت مولانا گنگوہی کا تعلیمی سفر بہت تیزی سے طے ہوا، دہلی پہنچ کر نصاب کی عام ترتیب کے مطابق غالباً کافیہ وغیرہ متوسطات سے پڑھنا شروع کیا تھا اور چار سال کی قلیل مدت میں دورۂ حدیث شریف تک جملہ درسیات کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر فارغ ہو گئے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

کہا جاتا ہے کہ قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا گنگوہی (رحمہما اللہ تعالیٰ) دونوں ساتھی اور ہم سبق تھے، ساتھ ہی پڑھا، ساتھ ہی فارغ ہوئے، یہ روایت زبانوں پر بھی ہے اور کئی مضامین و تحریرات میں بھی نقل ہوگئی ہے مگر یہ صحیح نہیں، اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا نانوتوی کا زمانہ تعلیم تقریباً ایک ہے اور دونوں کو حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی سے شرف تلمذ حاصل ہے، اسی وجہ سے یا غالباً وطنی نسبت اور قربت کی وجہ سے دونوں میں دوستی اور موانست و ملاقات کے گہرے مراسم تھے اور یہ بھی ہے کہ دونوں چند کتابوں میں ہم سبق اور ساتھ رہے مگر اکثر کتابوں اور تعلیم کی ترتیب میں ایک دوسرے سے مختلف رہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ۱۲۶۰ھ میں مولانا مملوک العلی کے ساتھ نانوتہ سے دہلی آئے تھے [۱۳] اور اسی وقت سے حضرت مولانا کی نگرانی میں سلسلہ تلمذ اور تربیت میں داخل تھے، مولانا محمد قاسم صاحب نے اپنی تعلیم کا اکثر وقت حضرت مولانا مملوک العلی کی صحبت و شاگردی میں گزارا اور دہلی کالج میں بھی داخل رہے، حضرت مولانا گنگوہی کس وقت دہلی آئے اس کا تعین مشکل ہے، بہر حال جب بھی آئے دہلی کے مختلف استاذوں اور علماء سے پڑھتے رہے، مولانا (گنگوہیؒ) حضرت مولانا مملوک العلی کے شاگردوں کی صف میں دیر سے شامل ہوئے اور حضرت مولانا سے تعلیم کے زمانہ میں بھی (دیگر) علماء، مثلاً مولانا احمد سعید مجددی اور مولانا مفتی صدر الدین آزردہ کے درس کے حلقوں میں حاضر ہوتے رہے، نیز حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا نانوتوی کی زیر تعلیم و تدریس کتابوں کی ترتیب میں بھی یکسانیت نہیں تھی اور اس کی بھی صراحت ملتی ہے کہ حضرت مولانا گنگوہی تعلیم سے فارغ ہو کر وطن واپس ہو گئے تھے، مگر حضرت مولانا نانوتوی غالباً آخری درجات یا حدیث شریف کے اسباق کی تکمیل فرما رہے تھے، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں بھی دونوں میں نہایت دوستی تھی، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ

دونوں بزرگ تمام کتابوں میں ساتھ اور سب اساتذہ کی مجلسوں میں ہم سبق ہوں نیز یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب تعلیم کے زمانہ میں حضرت مولانا مملوک العلی کے دولت کدہ پر قیام فرما ہے مگر مولانا گنگوہی کہاں رہے اس کی صراحت نہیں ملتی۔

تعلیم کے بعد

مولانا گنگوہی تعلیم سے فراغت کے بعد وطن آ گئے تھے، اگر مولانا چاہتے یا پسند کرتے تو بڑی سے بڑی سرکاری ملازمت یا ریاستوں میں عہدہ و منصب مل جاتا مگر مولانا نے شروع (غالبا طالب علمی کے وقت ہی سے) للہ دینی خدمت اور بلا کسی معاوضہ کے درس وافادہ کا ارادہ فرما لیا تھا، اور دہلی میں طالب علمی کے ساتھ ہی طلبہ کو اسباق شروع کرا دیے تھے، دہلی میں حضرت مولانا سے جو طلبہ وابستہ ہوئے اور مولانا سے تلمذ واستفادہ کیا اس میں مولانا ملا محمود دیوبندی بھی تھے (جو دیوبند میں پہلے مدرس مقرر کیے گئے تھے) اسی دور کے شاگردوں میں مولانا ابوالنصر گنگوہی اور مولانا ابوالقاسم گنگوہی بھی[14] شامل ہیں، دہلی میں اور طلبہ نے بھی پڑھا ہوگا مگر اس کی تفصیل دستیاب نہیں۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد گنگوہ آئے تو یہاں بھی تدریس کا سامان ہوگیا، سب سے پہلے نکوڑ سے مولوی سید مؤمن علی صاحب تعلیم کے لیے حاضر ہوئے اور پھر یہ سلسلہ ایسا جاری اور دراز ہوا کہ حیات کے آخری زمانہ تک کم وبیش چلتا رہا، آخری دور میں اس نے ایسی شہرت حاصل کی اور حضرت کے حلقہ درس میں ایسے منتخب طالب علم اور شائقین حدیث آئے جن کے دم سے ہندوستان میں خدمت حدیث کا گلستاں لہلہا اٹھا اور برصغیر کے دور دراز کونوں تک حضرت کے شاگرد پہنچ گئے اور ان میں سے اکثر نے اپنی اپنی جگہوں پر خدمت دین اور احیائے سنت کی بے نظیر خدمات انجام دیں۔

مولانا کے تلامذہ کا سلسلہ کس قدر وسیع ہوگیا تھا اور اس کے کیسے کیسے منافع واثرات تھے اس کا خود حضرت مولانا نے حضرت حاجی صاحب کے نام اپنے ایک خط میں (جو ۱۳۰۶ھ کا لکھا ہوا ہے) یوں ذکر فرمایا ہے۔

> ''حضرت مرشد من! علم ظاہری کا تو یہ حال ہے کہ آپ کی خدمت سے دور ہوئے غالبا عرصہ سات سال سے کچھ زیادہ ہوا[15] اس سال سے اب تک دوسو سے چند عدد زیادہ آدمی سند حدیث حاصل کر کے گئے اور اکثر ان میں وہ ہیں کہ انہوں نے درس جاری کیا اور سنت کے احیاء میں سرگرم ہوئے اور اشاعت دین ان سے ہوئی اور اس شرف سے زیادہ کوئی شرف نہیں اگر قبول ہو جاوے'' (مکتوب محررہ ۱۳۰۶ھ)[16]۔

بیعت واجازت

حضرت مولانا کی طالب علمی کے وقت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت مولانا مملوک العلینا نوتوی کے یہاں تشریف لاتے تھے، اور حضرت مولانا نانوتویؒ حاجی صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ (حالانکہ مولانا ملک کے نامور علماء میں سے تھے، اور حاجی صاحب سے عمر میں بھی بہت بڑے تھے) مولانا نانوتویؒ کے حضرت حاجی صاحب کے خاص احترام کی وجہ سے مولانا گنگوہی کو بھی حضرت حاجی صاحب سے محبت وعقیدت ہوگئی تھی، اسی

طرح (حضرت مولانا گنگوہیؒ پر) حضرت شاہ عبدالغنی کے علوِ مرتبت اور اتباع سنت کا بھی گہرا اثر تھا مگر تعلیم کے اختتام تک اس کا فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ کس سے بیعت ہونا چاہئے، زمانۂ طالب علمی تک حضرت شاہ عبدالغنی سے بیعت ہونے کا خیال تھا مگر گنگوہ سے آنے کے کچھ ہی دنوں بعد ایک ضرورت سے تھانہ بھون آنا ہوا جہاں حاجی صاحب قیام فرما تھے، اللہ کا کرنا کہ اس مقصد کے پورا ہونے سے پہلے حضرت حاجی صاحب کی توجہ سے مالا مال ہو گئے اور اسی سفر میں حضرت حاجی صاحب نے بیعت سے مشرف فرمایا۔

طبیعت کا جوہر پہلے سے صیقل شدہ اور تیار تھا اس لیے بیعت کے بعد اس کی آب وتاب میں روز افزوں اضافہ ہوا، اور حضرت پیر و مرشد پر بھی غالباً یہ منکشف ہو گیا تھا کہ وہ وقت دور نہیں کہ یہ نوعمر مسترشد اور تازہ دم فارغ طالب علم، دین اور علم کا آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے گا، اور اس کا وجود ملت کے لیے متاع بے بہا ثابت ہوگا اور اس کے دم سے ہزاروں خادمان حدیث تیار اور پچاسوں خانقاہیں آباد ہوں گی، یہی اس قافلہ کا قافلہ سالار اور دین وعلم کے شائقین کا مرجع ہوگا، اسلئے حضرت حاجی صاحب نے دو ملاقاتوں کے بعد مولانا کے تیسری مرتبہ تھانہ بھون آنے کے وقت اجازت وخلافت عنایت فرمادی، اور اس کے بعد جب حضرت حاجی صاحب گنگوہ گئے تو اپنی موجودگی میں ایک خاتون کو حضرت گنگوہی سے اپنے سامنے بیعت کرا کر گویا اس کا اعلان کر دیا کہ اب مولانا گنگوہی میرے قائم مقام ہیں۔

خدمات واثرات

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی اطلاع کے مطابق حضرت مولانا گنگوہی اپنی عمر کے اکیسویں سال (یعنی ۱۲۶۵ھ) میں تعلیم سے فارغ ہو کر گنگوہ واپس آ گئے تھے، اس وقت سے زندگی کے آخری ایام تک وہیں قیام کیا اور اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ دین کی خدمت، تعلیم وتدریس، اصلاح وارشاد اور معاشرہ کی برائیوں کو ختم کرنے میں گزارا، عقائد اور معاملات کے بگاڑ کو دور کرنے کی کوشش کی، فقہی مسائل ومباحث میں عوام وخواص کی رہنمائی، ان کے سوالات کے جوابات لکھنا، ان کے علمی وقلبی سوالات ومشکلات کے حل کی جستجو اور بھٹکے ہوئے آہو کو بہتر سے بہتر طریقے اور عمدہ سے عمدہ ترین تدبیر کے ذریعہ سے صحیح راستہ پر لانے کی دن رات بلکہ تمام عمر متواتر جد وجہد حضرت مولانا کا طغرائے امتیاز ہے۔

یہ بات بلاتردد کہی جا سکتی ہے کہ برصغیر ہند وپاکستان میں حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کے بعد اتباع سنت رسوم وبدعات کی تردید میں کوئی اور اس قدر طاقتور، بلند بانگ اور متواتر آواز نہیں اٹھی جیسی حضرت مولانا گنگوہی کی تھی، حضرت مولانا اس سلسلے کے وہ پہلے اور غالباً سب سے بڑے عالم ومرشد اور مصلح ہیں جنہوں نے اسی انداز وآہنگ میں اس پیام کی تجدید کی اور اس پیغام کی جس پر زمانہ گذرنے کے ساتھ کچھ میل سا آنے لگا تھا اس شان سے تجدید فرمائی کہ وہ پھر اک نئی قوت، نئی طاقت اور مسلسل تحریک بن کر عام ہو گیا۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ کے حلقۂ تربیت سے جو افراد اٹھے ان میں سے ایک بڑی تعداد ایسے علماء اور اصحاب

معرفت کی تھی جنہوں نے اس دعوت و پیام کو اپنا نصب العین بنا کر اپنی زندگیاں اس کی جد وجہد اور اس کی تبلیغ وترویج کے لیے وقف کر دی تھیں۔ اور انہوں نے اپنی سادگی، بے نفسی اور بے غرض کوشش سے اس کی جڑیں بہت دور تک اور اس طرح گہرائی تک پہنچا دی ہیں کہ ان سے خود بخود نئی نئی کونپلیں اور نئے نئے پودے پھوٹتے اور پروان چڑھتے رہتے ہیں، جو اس تحریک کے ایسے ہی پر جوش خادم بنتے ہیں اور راہ شریعت و سنت پر اسی طرح قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کرتے ہیں جس طرح ان کے بزرگوں اور اس خانوادے کے اکابر علماء نے چلنے کی کوشش کی تھی۔

یہاں یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ خانوادۂ ولی اللہی کی وراثت اور نیابت و نمائندگی کا سب سے بہتر نمونہ اور جامع ترین ترجمانی وہ ہے جو علمائے دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہ کے ذریعہ سے ہوئی اور ہو رہی ہے۔ لیکن ان دونوں اداروں اور ان کے متاخر وابستگان کو فکر ولی اللہی کا ایسا موقع اور شاندار ترجمان بنانے، نیز اتباع سنت، شریعت و تصوف کی جامعیت اور حدیث شریف کے اعلیٰ ترین مدارج کے حصول کے ساتھ حنفیت کی پاسداری نیز دین و شریعت اور اسلام پر اندرونی و بیرونی جماعتوں، طبقات اور گروہوں کی طرف سے اعتراضات اور رخنہ اندازی کی کوششوں کے دفاع کا سبق کس سے ملا؟ اس میں صرف دو ہی حضرات کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہما۔ مگر یہ بات قابل غور ہے کہ اگر چہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی فرماتے تھے لیکن مصروفیات اور مطابع سے وابستگی کی وجہ سے حضرت مولانا نانوتوی کا دیوبند میں کم وقت گزرا، اور ابھی مدرسہ دیوبند کو قائم ہوئے دس برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے اور اس کے قیام کے جو مقاصد تھے وہ سب پوری طرح بروئے کار نہ آنے پائے تھے کہ حضرت مولانا نانوتوی رحلت فرما گئے۔ مگر حضرت مولانا گنگوہی دونوں اداروں کے سرپرست اور مربی تھے، حضرت مولانا گنگوہی کی عملی جد وجہد کا دائرہ بہت سے گوشوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اور حضرت مولانا نانوتوی کی وفات کے بعد حضرت مولانا گنگوہیؒ دارالعلوم کے اور بعد میں مظاہر علوم کے بھی سرپرست بنائے گئے، دونوں مدرسوں کے تمام معاملات میں حضرت مولانا کی رائے قول فیصل اور حکم کا درجہ رکھتی تھی، اگر چہ حضرت مولانا گنگوہی دونوں مدرسوں کے آغاز کے وقت سے ہی دونوں کے معاملات میں مشیر اور کسی قدر دخیل بھی تھے اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی وفات کے بعد مدرسہ دیوبند کے سرپرست اول بنا دئے گئے تھے۔ یہی مظاہر علوم سہارنپور میں بھی ہوا۔ اگر چہ مظاہر علوم کے سرپرستوں کی فہرست میں حضرت مولانا کا نام دیر میں آیا، مگر مدرسے کے قیام کے وقت سے مدرسے کے ذمہ داران خصوصاً مولانا محمد مظہر نانوتوی حضرت مولانا کے خاص نیاز مند اور حاضر خدمت رہنے والے علماء میں تھے، جو کوئی بھی کام حضرت مولانا کے مشورے کے بغیر نہیں کرتے تھے۔

اس طرح ان دونوں مدرسوں کے تقریباً تمام اختیارات حضرت مولانا گنگوہی کے پاس آگئے تھے۔ اور یوں بھی دونوں مدرسوں کے اکثر ذمہ داران اور اساتذہ حضرت مولانا کے دامن تربیت سے جڑے ہوئے تھے، اور مولانا کو دونوں

مدرسوں کے اساتذہ اور طلباء کی تربیت کا وسیع موقع ملا۔ یہ دونوں مدرسے ۲۵ ؍برس سے زائد عرصے تک حضرت مولانا کی نگرانی اور سرپرستی میں رہے اور مولانا کی افکار و تعلیمات اور طریقہ تعلیم و تربیت کا نمونہ اور مثال بن گئے تھے۔

حضرت مولانا کے حسن تربیت اور عنایات و محبت کے سبب حضرت مولانا کے اخلاق و کردار کے تمام محاسن، فکر و خیال کے اثرات، اتباع سنت کی رعنائی اور دین خالص پر عمل کا جذبہ مولانا کے شاگردوں اور متوسلین میں گھر کر گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی تدبر و دانائی، علم و عمل، فقہ و حدیث کی جامعیت اور اصلاح و تربیت کے ساتھ معاشرتی خرابیوں کے خلاف جدوجہد اور تمام غیر دینی، غیر اسلامی آوازوں اور فتنوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کی بنیادی صفات دونوں مدرسوں کے ذمہ داروں اور استاذوں میں منتقل ہوگئی تھیں جو دونوں مدرسوں کے لئے متاع بے بہا اور در شہوار ثابت ہوئیں، ان مدرسوں کے اکثر طالب علموں نے یہی نہیں کہ ان محاسن کی قدر کی، ان کو سینہ سے لگایا بلکہ ان کو اپنی زندگی کے سفر اور دینی خدمات کے لیے رہنما اور نمونہ بنالیا، یعنی حضرت مولانا گنگوہی کے فکر و مزاج کی خصوصیات و امتیاز حضرت مولانا کے فیض تربیت اور صحبت کی برکت سے ان مدرسوں کے متعلقین کے فکر و مزاج میں اس طرح رچ بس گئیں کہ گویا ان کے وجود کا ایک ضروری حصہ بن گئی ہیں، اسی فکر و مزاج کو 'دیوبندیت' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا کا یہ ان مدرسوں اور ان کے متوسلین اور نام لیواؤں پر ہی نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دارالعلوم دیوبند نیز مظاہر العلوم سہارنپور کے تربیت یافتہ اور ان سے وابستہ علمائے کرام کے ذریعہ سے جو دینی خدمات اب تک انجام پائی ہیں ان کی بنیاد اور فکر میں حضرت مولانا گنگوہی کے گہرے اثرات پوری طرح شامل اور گویا ایک ایک کام کا ناقابل تقسیم حصہ ہیں۔ جوان مدرسوں کے وابستگان کے کام بلکہ روح ہیں، امید ہے کہ انشاء اللہ آئندہ بھی اسی طرح شریک و شامل رہیں گے۔

حواشی

۱۔ تذکرۃ الرشید جلد اول، ص، ۱۵۔

۲۔ سرسل، جس کو اب سرسلی کہا جاتا ہے، بڑوت سے میرٹھ جانے والی سڑک پر موضع جو ہڑی اور بنولی کے بیچ میں سڑک سے کچھ فاصلہ پر ہے، کسی زمانہ میں یہ گاؤں ایک بڑی اور نہایت پر رونق آبادی تھی، اب ایک بہت چھوٹا اور گم نام گاؤں ہے، جس میں غیر مسلم آباد ہیں، مسلمانوں کے گنتی کے چند گھر رہ گئے ہیں، بعد میں یہ خانوادہ سرسل سے برناوہ آگیا تھا جو اسی نواح کا ایک اور قصبہ ہے، یہاں اس کو بہت عروج ہوا، بڑے بڑے نامور مشائخ اہل اللہ اور علماء اس میں پیدا ہوئے جس میں سے شیخ بدر الدین برناوی کو بہت عروج ہوا، حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ ہیں اسی طرح اور بھی متعدد اصحاب ہیں۔

۳۔ علمائے فرنگی محل کے احوال پر تمام معتبر کتابوں میں اس کا ذکر بلکہ خاصی تفصیل درج ہے، مثلاً ملاحظہ ہوں، الف: اغصان اربعہ ب: احوال علمائے فرنگی محل، شیخ الطاف الرحمان بارہ بنکوی ج: تذکرہ علمائے فرنگی محل، مفتی عنایت اللہ صاحب۔

۴۔ تذکرۃ الرشید جلد اول، ص ۱۳۔

۵۔ تذکرۃ الرشید ص: ۱۷، ج، اول۔

۶۔ مولانا شاہ محمد غوث گنگوہ کی ایک معروف شخصیت اور شیخ طریقت تھے، جو شاہ محمد رمضان "ہادی ہریانہ" شہید ۱۲۴۰ھ کے خلیفہ مجاز تھے، "ہادی ہریانہ" تالیف، پروفیسر منظور الحق صدیقی، ص، ۱۴۸ (لاہور، ۱۹۶۳)۔

مولانا محمد غوث کی متوسلین کے لیے تعلیم و ہدایات پر مشتمل چند مختصر و متفرق تحریریں ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہیں۔

۷۔ مولانا عاشق الہی نے یہ نام محمد بخش لکھا ہے (تذکرۃ الرشید ص: ۲۷، ج: ۱) صحیح نام محمد حسن ہے، (مقامی طور پر محمد بخش کے نام سے بھی جانے جاتے تھے) مولانا محمد حسن حضرت مولانا مملوک العلی کے شاگرد، صاحب فضل و کمال اور صاحب ارشاد معرفت بزرگ تھے، مولانا محمد حسن نے مدینہ منورہ جا کر حدیث شریف پڑھی تھی، حضرت مولانا گنگوہیؒ کو مولانا محمد حسن صاحب سے ابتدائی درسیات میں تلمذ کے علاوہ دلائل الخیرات اور حزب البحر کی اجازت بھی حاصل تھی، مولانا محمد حسن شاہ امام علی کے خلیفہ اور بڑے مرتبہ کے بزرگ تھے، مولانا کی ۱۷ ذیقعدہ ۱۲۵۹ھ (دسمبر ۱۸۴۳ء) میں وفات ہوئی، مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو "تذکرۃ العابدین" ص: ۵۳ تا ۵۷ (دہلی: ۱۳۳۳ھ) اور "انوار العاشقین" مولانا مشتاق احمد صاحب انبیٹھوی ص: ۳۴: ۱۳۵ (لاہور ۱۳۹۸ھ)۔

۸۔ تذکرۃ الرشید، ص ۳۰، ج: اول (عکس طبع اول، سہارنپور ۱۹۷۷ء)

۹۔ مولانا احمد الدین کو مولانا میرٹھی نے جہلمی لکھا ہے، لیکن ڈاکٹر سفیر اختر صاحب (اختر راہی) نے ان کو کرسالی ضلع چکوال کا باشندہ بتایا ہے اور بہ ظاہر یہی صحیح ہے، تذکرہ علمائے پنجاب ص ۸۰، ج: اول (لاہور ۱۹۹۸ء)

۱۰۔ تذکرۃ الرشید جلد دوم ص: ۱۸۰۔

۱۱۔ تذکرۃ الرشید ص، ۳۰۔ ۳۱، ج: اول۔

۱۲۔ حضرت مولانا محمد قاسم کے تعلیم کے لیے دہلی آنے کا سنہ عموماً ۱۲۶۰ھ نقل کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے، صحیح ۱۲۶۱ھ (جنوری ۱۸۴۴ء) ہے جو یہاں لکھا گیا ہے، تفصیل و تحقیق کے لیے رجوع فرمائیں راقم سطور کی تالیف "قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ احوال و آثار و باقیات و متعلقات" ص: ۱۷۷۔ ۱۷۸ وغیرہ (طبع اول، کاندھلہ: ۱۴۲۱ھ)

۱۳۔ تذکرۃ الرشید ص ۳۷، ج: اول

۱۴۔ حضرت مولانا گنگوہی اپنے تیسرے سفر حج سے ۱۳۰۰ھ میں گنگوہ واپس پہنچے تھے

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی الٰی رحمۃ اللہ

الفرقان پریس جا چکا ہے، پلیٹیں بھی بن چکی ہیں، ابھی ابھی یہ اطلاع ملی کہ آج تہجد کے وقت مشہور معالج اور ملت کا یہ مخلص اور دردمند خادم اس جہانِ آلام کو چھوڑ کر اپنے ربِ غفور کے حضور حاضر ہو گیا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون۔**

ڈاکٹر صاحب گذشتہ کئی سال سے مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آخری چند ماہ تو مکمل صاحب فراش رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی ان تکلیفوں کو ترقی درجات کا ذریعہ بنائے۔

ڈاکٹر صاحب کا نوجوانی کے زمانے میں ہی حضرت مولانا علی میاں اور حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ علیہما سے تعلق ہوا اور ان کی ذات پر اس تعلق کا اثر بھرپور رہا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں ان حضرات کی تمام ملی سرگرمیوں میں ڈاکٹر صاحب معاونِ خاص بن گئے۔ گذشتہ دہائیوں میں ملت کے تمام اہم کاموں میں ڈاکٹر صاحب سرگرمی سے شریک رہے۔ خوش اوقات اور پابند معمولات تھے۔ اس سب کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کا ایک بڑا صدقۂ جاریہ بچیوں کی تعلیم و تربیت کی وہ تحریک ہے۔ جس کے ڈاکٹر صاحب بانی نہیں تو ایک بہت بڑے داعی ضرور تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بچیوں کا ایک دینی مدرسہ قائم کیا، اس کی دعوت دی، اس کے بعد ہی اللہ نے اس سلسلے کو عام فرمایا۔ ان سطروں کا مقصد دعائے مغفرت کے اہتمام کی درخواست ہے۔ حق مغفرت کرے، ان کے اہل خانہ اور صاحبزادگان کو صبر دے اور ان کا جانشین بنائے۔ آمین (ادارہ)

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

امام العصر، محدّث جلیل
حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرّہ
احوال وخدمات اور کمالات کی ایک جھلک

دوسری قسط

فقہی خدمات

حضرت مولانا کی شخصیت مختلف حیثیتوں اور پہلوؤں کی جامع تھی، حضرت مولانا اگر ایک جانب بڑے محدث بلکہ اپنے عہد میں پیشوائے محدثین تھے، تو دوسری جانب فقہ وفتاوی میں بھی فخر اقران تھے، حضرت مولانا کے فتوے کی حیثیت سکۂ رائج الوقت کی تھی، برصغیر میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اپنے معاملات ومسائل کے حل کے لیے حضرت مولانا کی طرف دیکھتا تھا، حضرت مولانا کا جو فتوی ہوتا وہ ان سب کے لیے دینی دستاویز اور راہ ہدایت کی سند ہوتا تھا، عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، سلوک ومعرفت، رسوم وبدعات کی حقیقتوں کے فیصلے میں سب اس فتوے کے محتاج رہتے تھے، جب مولانا کا فتوی صادر ہو جاتا تھا تو ضبط واحتیاط کے ساتھ اس پر عمل کیا جاتا تھا اور اکثر مسلمان اس کو اپنے لیے اسوہ اور خیر وبرکت کا سامان سمجھتے تھے۔

حضرت مولانا کی خدمت میں ہندوستان کے کونہ کونہ سے بڑی تعداد میں روزانہ مختلف سوالات آتے تھے جس میں ایک خاصا حصہ ممتاز اہل علم، اصحاب فقہ وفتاوی کے شبہات ومباحث اور سلوک کی مشکلات وضروریات پر مبنی خطوط اور سوالات کا ہوتا تھا، بے شمار اصحاب اپنے درد کا درماں تلاش کرنے اور اپنی علمی تشنگی دور کرنے کے لیے حضرت مولانا کی خدمت میں خطوط اور سوالات بھیجتے تھے، اور حضرت مولانا کے قلم برداشتہ جوابات سے ان کے دل کی کلی کھل جاتی اور مقصود حاصل ہو جاتا تھا، اس کے علاوہ عام مسلمانوں کے سوالات وفتاوی کی بھی ایک بڑی تعداد ہوتی تھی جس کی کثرت کا اس سے اندازہ ہوگا کہ بعض مخلص سادہ لوح اصحاب ایک ایک وقت میں جو سوالات بھیجتے تھے وہ دو چار نہیں بلکہ کبھی کبھی سو دو سو سے بھی زائد ہوتے تھے، مگر حضرت مولانا اس کا کچھ خیال نہیں فرماتے تھے بلکہ

خندہ پیشانی اور کشادہ قلبی سے ان کے فوراً جواب تحریر فرماتے تھے، جس کے لیے نہ کسی قیمت کا مطالبہ تھا نہ کسی کی خوشی ناخوشی کی پرواہ، جو کلمہ حق ہوتا بلا تامل تحریر فرمادیتے، اگرچہ حضرت کے چند فتاویٰ پر مخالفین نے بڑا ہنگامہ برپا کیا، مدتوں مخالفت اور جوابی تحریرات اور رسائل واشتہارات کا شور رہا، لیکن اگر مولانا نے کسی مسئلہ کی تحقیق فرما کر حق جان کر لکھا تھا تو اس سے رجوع کر لینا ممکن نہیں تھا، لاکھ مخالفت ہو، لیکن اسی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اگر کسی فتویٰ کی غلطی پر یا کسی مسئلہ کے پہلو پر کسی عامی نے بھی توجہ دلادی اور واقعۃً وہ مسئلہ غلط بتادیا گیا تھا یا وہ جواب غلط لکھا گیا تھا تو حضرت مولانا اس سے برملا اور صاف لفظوں میں رجوع فرمالیتے تھے، اس کا صاف صاف اعلان کیا جاتا اور اس کی تشہیر کرائی جاتی تھی۔

حضرت کا ایک خاص معمول

حضرت مولانا کا ایک اہم معمول یہ بھی تھا کہ اگر کوئی اہم بات پیش آگئی یا کسی دینی شرعی مسئلہ میں عوام میں اختلاف ہوا یا کسی نئے طور طریقہ کا آغاز ہوا، کوئی بدعت یا رسم عام ہوئی تو حضرت مولانا خود ایک سوال مرتب کرا کر، یا آئے ہوئے سوالات میں سے بہتر اور جامع سوال کا مفصل جواب تحریر فرماتے تھے۔ اور اس جواب کو اشتہار کی صورت میں بڑی تعداد میں چھپوا کر ملک کے کونے کونے میں پہنچادیا جاتا تھا، اس طرح حضرت مولانا کی رائے بھی سامنے آجاتی تھی اور صورت مسئلہ بھی واضح ہوجاتی تھی، حضرت مولانا کے اس طرح چھپوائے ہوئے اشتہارات کی خاصی بڑی تعداد تھی، غالباً سو سوا سو اشتہار چھپے ہوں گے مگر افسوس وہ کہیں یکجا دریافت نہیں مختلف ذرائع سے متعدد اشتہارات کا علم ہوتا ہے اور اس قسم کے دو اشتہار ہمارے ذخیرہ میں بھی موجود ہیں۔

مولانا کے فتاویٰ کے مجموعے

حضرت مولانا کے فتاویٰ کے سات آٹھ مجموعے حضرت مولانا کی زندگی میں مرتب ہوگئے تھے مگر تعجب ہے کہ ان میں سے ایک بھی شائع نہیں ہوا، حضرت کے فتاویٰ کا صرف ایک مجموعہ جو حافظ عزیز الدین صاحب مراد آبادی (وفات ۱۳۶۷ھ۔۱۹۴۸ء) نے مرتب کیا تھا چھپا ہے، یہ مجموعہ فتاویٰ تین حصوں پر مشتمل ہے، جس میں سے پہلا حصہ حضرت مولانا کی زندگی میں چھپ گیا تھا، ایک اور مجموعہ جو حضرت مولانا کے غیر مطبوعہ فتاویٰ کے مجموعوں اور حضرت کے خود نوشت جوابات پر مشتمل ہے راقم سطور نے مرتب کیا ہے، زیر کتابت ہے۔

رسائل اور تصنیفات

حضرت مولانا کی اردو فارسی میں متعدد تصنیفات ہیں بلا ترتیب چند نام درج ہیں، مگر یہ حضرت کی تالیفات ورسائل، کی مکمل فہرست نہیں ہے، ان کے علاوہ بھی چند تالیفات ورسائل ہیں۔

۱۔	ہدایۃ الشیعہ	سن تالیف ۱۲۸۸ھ
۲۔	زبدۃ المناسک	سن تالیف ۱۲۹۹ھ
۳۔	الرأی النجیح فی عدد رکعات التراویح	سن تالیف ۱۳۱۵ھ
۴۔	ردالطغیان فی اوقاف القرآن	سن تالیف ۱۳۱۷ھ
۵۔	اوثق العریٰ	سن تالیف ۱۳۱۷ھ
۶۔	القطوف الدانیہ فی تحقیق الجماعۃ الثانیہ	
۷۔	سبیل الرشاد	
۸۔	ہدایۃ المعتدی فی قرأۃ المقتدی	
۹۔	الشمس الملامعہ فی کراہۃ الجماعۃ الثانیہ	
۱۰۔	ترجمہ امدادالسلوک اردو	
۱۱۔	فتاویٰ میلاد	
۱۲۔	فتویٰ احتیاط الظہر وغیرہ	

یہ تالیفات اگر چہ چھوٹے چھوٹے رسائل ہیں، بڑی اور مفصل کتابیں نہیں، لیکن یہ مختصر رسائل بھی علوم کی کلید اور بڑے فنی مباحث کا گویا عطر اور جوہر ہیں، ان کا ایک ایک لفظ حل مباحث میں مددگار اور ہر اک فقرہ اک مخزن معانی ہے۔

ان کے علاوہ متعدد وابستگان اور شاگردوں نے حضرت مولانا کے مکتوبات اور افادات یا علمی سوالات کے جوابات یکجا کر کے شائع کیے ہیں، جس میں سے کئی حضرت کی تالیف کی حیثیت سے مشہور ہیں، مگر حقیقت میں وہ حضرت مولانا کی تالیف نہیں، افادات ہیں۔

صحیح بخاری، ترمذی وغیرہ کی درسی تقریریں

مگر مذکورہ بالا تحریرات و رسائل سے کہیں زیادہ قیمتی اور گراں قدر یادگار حضرت مولانا کی درس حدیث شریف کی تقریریں ہیں، حضرت مولانا کے متعدد شاگردوں نے اپنے اپنے زمانہ تدریس وتعلیم میں حضرت کے وہ ارشادات جو حضرت درس کے موقع پر بیان فرماتے تھے محفوظ اور قلم بند کر لیے تھے، جس میں سب سے بڑا سرمایہ اور اہم ترین خدمت وہ ہے جو مولانا یحییٰ کاندھلویؒ نے ان افادات یا تقریروں کی اشاعت کا ارادہ کیا اور ان پر نہایت قیمتی فوائد واضافات اور مفصل حاشیوں کا اضافہ کر کے ان کو اس شان سے شائع کیا کہ ان میں سے ہر ایک مجموعہ بڑی شروحات کا قائم مقام اور علم حدیث کے علماء کے لیے بیش قیمت تحفہ ثابت ہوا، صحیح بخاری کے افادات الـلامع

الدراری کے نام سے اور سنن ترمذی کے الکوکب الدری کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں اور پوری علمی دنیا میں علمائے کرام اور حدیث شریف کے شائقین کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں اور اپنی بڑی جلدوں اور ضخامت کے باوجود کثرت سے چھپتے رہتے ہیں۔

حدیث شریف کی شرح، اس کی تفہیم اور مذاہب فقہاء سے اس کی صحیح تطبیق، متعارض احادیث میں وجہ ترجیح اور بعض مطالب کی وضاحت میں مولانا کی وقت نظر اور غیر معمولی دست رس کا تو حضرت کی درسی تقریروں کے مطالعہ سے ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے، خصوصا حضرت مولانا احادیث شریفہ کی جو توجیہات کرتے ہیں اور بعض مطالب بیان فرماتے ہیں وہ مولانا کا امتیاز اور منفرد حصہ ہے، ان توجیہات وشروحات کی وجہ سے بلاشبہ حضرت مولانا کو امت کے اہم ترین محدثین اور شارحین حدیث میں شمار کیا جاسکتا ہے مولانا محمد یوسف صاحب بنوری فرماتے ہیں کہ:

> ''ہمارے اکابر دیوبند توجیہات کے باب میں بہت آگے ہیں، حضرت شاہ عبد العزیز اور ان کے بعد حضرت گنگوہی نے بہترین توجیہات پیش کی ہیں، جب کہ حضرت شاہ عبد العزیز کے بعد حضرت گنگوہی وہ شخص ہیں جنہوں نے محض اپنے نور قلب سے حدیث کی مشکلات حل کی ہیں اور کچھ تھوڑا سا حصہ حضرت شیخ الہند کو بھی اس سے ملا ہے۔''[۱۷]

مولانا کو حدیث شریف کے معانی ومطالب اور توجیہات پر جو غیر معمولی دست رس تھی اس کا ایک اجمالی اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت مولانا کے عہد کے جلیل القدر علماء اور محدثین اپنے سوالات کے جوابات اور حل مشکلات کے لئے حضرت مولانا سے رجوع کرتے رہتے تھے۔ جن میں فخر المتأخرین حضرت مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ اور اہل حدیث کے نامور عالم مولانا محمد حسین بٹالویؒ کے نام بھی شامل ہیں، مولانا عبد الحی فرنگی محلی حضرت مولانا کو احادیث کی شرح وتحقیق کے لیے خطوط لکھتے رہتے تھے، اسی طرح مولانا محمد حسین بٹالوی بھی (فقہی اختلافات کے باوجود) بعض احادیث کے مطالب ورموز کی شرح وتفہیم کے لیے حضرت مولانا سے رجوع کرتے تھے، حضرت مولانا عبد الحی فرنگی محلی کی مراسلت دستیاب نہیں لیکن مولانا محمد حسین کے چند خطوط کے جوابات معلوم ہیں۔

فقہی موضوعات تو مولانا کی اس طرح دست رس میں تھے جیسے وہ مولانا کے لیے خاص طور سے مسخر کیے گئے ہوں، فقہ حنفی میں مولانا کے علو مرتبہ کا کچھ اندازہ کرنے کے لیے محدث جلیل حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی رائے کا تذکرہ ضروری ہے، علامہ حضرت مولانا کو نامور فقیہ اور مرجع فقہ حنفی علامہ شامی پر ترجیح دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ حضرت مولانا گنگوہی فقیہ النفس تھے، شامی فقیہ النفس نہیں تھے۔[۱۸]

حضرت شاہ صاحب نے بھاول پور میں قادیانیوں کے خلاف مقدمہ میں بیان دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

''روافض کے اکفار میں اختلاف ہے، علامہ شامی ابن عابدین عدم تکفیر کی طرف مائل ہیں، اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اکفار کرتے ہیں (یعنی ان کو کافر قرار دیتے ہیں) ہمارے نزدیک بھی یہی صحیح ہے، اصل میں جو ابتلا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کو پیش آیا وہ علامہ شامی کو پیش نہیں آیا، مسئلہ کا اختلاف نہیں ابتلاء کا ہے، ویسے ہمارے نزدیک حضرت شاہ صاحب علامہ شامی سے فقیہ ہیں، اور حضرت گنگوہی کو بھی ہم نے شامی سے فقیہ النفس پایا''[۳]

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حضرت شاہ صاحب حضرت مولانا گنگوہی کو مجتہد فرماتے تھے، حضرت علامہ نے حضرت گنگوہی کی شان میں جو قصیدہ لکھا تھا اس میں بھی اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے، فرماتے ہیں:

الیہ المنتہی حفظا و فقہا و أضحی فی الروایۃ کالمدار
ففی التحدیث رحلۃ کل راو وفی الأخبار عمدۃ کل قاری
فقیہ النفس، مجتہد، مطاع وکوثر عملہ بالخیر جاری[۴]

اور جب ۲۶/ربیع الثانی ۱۳۳۰ھ (۱۵/اپریل ۱۹۱۲ء) میں علامہ رشید رضا مصری دار العلوم دیوبند آئے تھے اس وقت حضرت شاہ صاحب نے مجلس استقبالیہ میں جو ایک بے نظیر تقریر کی تھی اس میں یہ بھی فرمایا تھا کہ:

''کثرت الفتیا وازدحمت المسائل علی الشیخ رشید احمد حین التبس الحق بالباطل، فأجاب فیھا بالصواب وکان فقیھا مجتھدا، فاخذنا ذلک اماما فی الاصول وھذا اماما فی الفروع''[۵]

ترجمہ: جب اختلافی مباحث مسائل کی کثرت ہوئی اور حق کو باطل سے ملایا جانے لگا تو مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں کثرت سے سوالات آنے لگے، حضرت مولانا نے صحیح (اور واضح) جوابات سے امت کی رہنمائی کی وجہ فقیہ مجتہد تھے، تو ہم نے ان (حضرت شاہ ولی اللہؒ) کو اصول میں امام قرار دیا اور حضرت مولانا گنگوہی کو فروع میں۔

حضرت مولانا کے علمی مراتب، کمالات علمی اور خدمات کا کم سے کم تعارف بھی زیر نظر سطور میں آسان نہیں ہے، اہل نظر اور اکابر علماء کی رائے بلکہ فیصلہ یہ ہے کہ حضرت مولانا حدیث وفقہ، سلوک ومعرفت اور ارشاد وتربیت میں بلاشبہ اپنے عہد کے امام اور اپنے معاصرین میں متعدد حیثیوں سے ممتاز تھے جس کا مختصر سے مختصر تعارف بھی خاصی تفصیل چاہتا ہے، جس کی زیر نظر صفحات میں گنجائش نہیں۔

سلوک وتصوف کے امام

حضرت مولانا، خانوادۂ ولی اللہی کے اکابر اور طریقہ کے مطابق علمی کمالات، محدثانہ شان اور فقیہانہ ژرف

نگاہی کے علاوہ سلوک و معرفت میں بھی کامل اور بلاشبہ فرد فرید تھے، حضرت مولانا کے پیر و مرشد اور برصغیر ہند میں سلوک و معرفت کے امام حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی سے اجازت و خلافت حاصل تھی، حضرت حاجی صاحب، حضرت مولانا کو اپنے خلفاء اور وابستگان میں سب سے بہتر اور صفات و کمالات میں اس عہد کے مشائخ و اہل معرفت کا پیشوا سمجھتے تھے، حاجی صاحب نے اپنی کتاب ''ضیاء القلوب'' میں حضرت مولاناؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا تذکرہ فرما کر یہاں تک لکھ دیا حق یہ تھا کہ میں ان کی جگہ ہوتا وہ میری جگہ، یعنی وہ اس مرتبہ کے بزرگ ہیں کہ مجھے ان سے بیعت اور ان کا نیاز مند ہونا چاہئے تھا حالانکہ معاملہ الٹا ہے، تحریر فرماتے ہیں۔

''و نیز ہر کس کہ ازیں فقیر محبت و عقیدت و ارادت دارد مولوی رشید احمد سلمہ و مولوی محمد قاسم سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اند بجائے من فقیر راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق از من شمارند، اگرچہ بظاہر معاملہ برعکس شد کہ اوشاں بجائے من و من بمقام اوشاں شدم، و صحبت اوشاں را غنیمت دانند کہ ایں چنیں کساں دریں زمان نایاب اند، و از خدمت بابرکت ایشاں فیضیاب بودہ باشند۔''[۶]

بعد میں بھی کئی تحریروں اور خطوط میں اپنی اسی رائے کا اظہار و تکرار فرمایا ہے، بدعات و رسوم کی تردید کی وجہ سے حضرت مولانا کے خلاف شورش برپا کرنے کی بہت کوشش کی گئی، حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں بھی قسم قسم کی اطلاعات اور روایتیں پہنچائی گئیں، اور ادھر ہندوستان میں اس کا چرچا شروع کیا کہ اب حضرت حاجی صاحبؒ حضرت مولاناؒ گنگوہی سے ناخوش ہیں اور حضرت مولانا کی پیر و مرشد کی نگاہ میں ویسی منزلت نہیں رہی، تو حضرت حاجی صاحب نے اس کی صاف لفظوں میں تردید کی اور متوسلین کو تحریر فرمایا کہ:

''اور مولانا محمد رشید احمد صاحب کے مقدمے میں بالہام غیبی ضیاء القلوب میں جو کچھ لکھ چکا ہوں وہی ہے، جو فقیر سے ارادت و محبت رکھتا ہے وہ ان سے بھی محبت رکھتا ہے، اور جو ان کا مخالف اور دشمن ہے فقیر کا بھی ہے، اب فقیر کے اخوان میں مولوی صاحب موصوف پر کسی کو فضیلت نہیں، اور جو کوئی کہے کہ فقیر نے مولانا کو علاحدہ کر دیا ہے وہ کذاب ہے، مولانا کی محبت کو فقیر وسیلہ نجات کا سمجھتا ہے۔ فقط''[۷]

حضرت مولانا گنگوہیؒ کی وفات سے تقریباً گیارہ سال پہلے ۱۳۱۲ھ میں نزہۃ الخواطر کے مصنف اور نامور مؤرخ مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلوی جو ایک بڑے دینی علمی گھرانے کے فرد، جید اور ذہین عالم، نیز حضرت سید احمد شہید کی نسبتوں کے امین تھے، گنگوہ حاضر ہوئے تھے، وہ اپنا مشاہدہ اور رائے یوں درج کرتے ہیں۔

''اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب بقیۃ السلف ہیں، ان کا وجود مغتنمات میں سے ہے، اس تورع و استقامت کا دوسرا شیخ ان کے سوا اس زمانہ عالم آشوب میں نظر نہیں آتا علم الٰہی میں جو کوئی ہو اس کی خبر نہیں، مولوی صاحب کے اوصاف میں سب سے بڑا وصف تورع ہے''[۸]

لطافت مزاج

حضرت مولانا نفیس مزاج، لطیف طبیعت تھے، حضرت مولانا کا لباس، قیام گاہ، کتابیں اور استعمال کی ایک ایک چیز اور خانقاہ بھی انتہائی صاف ستھری رہتی تھی، ہر اک کام میں نفاست اور سلیقہ کو پسند فرماتے تھے، معمولی سی بے ترتیبی یا بد سلیقگی کا بھی طبیعت پر اثر ہوتا تھا، سادگی کے ساتھ تجمل کا اہتمام رہتا تھا، ذرا کوئی بات نفاست کے خلاف ہوئی اور حضرت مولانا نے اس کا احساس فرمایا۔

حضرت مولانا مسجد میں ماچس جلانے سے منع فرماتے تھے کیوں کہ اس میں گندھک کی خفیف سی بو ہوتی ہے، حضرت مولانا کو اس کا بھی بہت احساس ہوتا تھا، ذوق کی لطافت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا کے مسجد سے جانے کے بعد کسی خادم نے مسجد کا چراغ ماچس سے جلا کر روشن کر دیا، جب تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد حضرت مولانا عشاء کی نماز کے لیے مسجد میں آئے تو حضرت مولانا نے گندھک کی بو محسوس کر لی فرمایا کہ ''فضا میں اس کا اثر ہے'' اور ہدایت کی کہ مسجد میں ماچس نہ جلائی جائے۔

اسی طرح مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے جو حضرت کے ہر وقت کے حاضر باش اور خادم تھے (بعد میں دارالعلوم دیوبند کے مہتمم ہوئے) چائے بنا کر پیش کی، تو فرمایا کہ کچے پانی کی بو آرہی ہے، مولانا نے بہت غور کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا، دوسرے دن اور احتیاط کی مگر حضرت کا یہی فرمانا تھا کہ پانی کی بو آرہی ہے، کئی دن کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن کا ذہن ادھر متوجہ ہوا کہ چائے کی پیالی کو ٹھنڈے پانی سے دھو کر تولیہ سے صاف کرلیا ہے اس لیے ٹھنڈے پانی کا اثر حضرت محسوس فرماتے ہیں، جب پیالی کو گرم پانی سے دھویا تو یہ شکایت ختم ہوئی۔

آخری علالت اور وفات

حضرت مولانا اپنی بعض لمبی اور سخت بیماریوں کے باوجود اپنے معمولات اور دینی خدمات سرانجام دے رہے تھے کہ اسی درمیان ایک رات جب تہجد میں مشغول تھے کسی جانور نے پاؤں کی انگلیوں میں کاٹا جس سے بہت خون نکلا مگر حضرت مولانا ایسی محویت اور حضور کے عالم میں تھے کہ نہ کاٹنے کا احساس ہوا نہ خون نکلنے کی خبر ہوئی، جب نماز کے لیے حجرہ سے باہر نکلے تو ایک خادم نے خون کے اثرات دیکھے، اس وقت لباس وغیرہ بدل کر نماز پڑھائی مگر اس کے بعد طبیعت کمزور ہوگئی، چند دن کے بعد پیروں پر ورم آنا شروع ہوا جو زانو تک پہنچ گیا اور یہی بیماری آگے چل کر مرض الوفات ثابت ہوئی۔ تقریباً بیس دن بیمار رہ کر ۸/ جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱/اگست ۱۹۰۵ء کو جمعہ کے دن اٹھتر (۷۸) سال سات مہینہ کی عمر میں وفات پائی، اسی دن شام کو مغرب کے بعد گنگوہ میں دفن کیا گیا، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

حواشی

ا۔ مکاتیب رشیدیہ، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص: ۱۰ (طبع اول میرٹھ ۱۳۴۴ھ)

۲۔ ماہنامہ بینات، مولانا محمد یوسف بنوری نمبر، ص:۱۲۲ (کراچی ۱۳۹۸ھ ۱۹۷۸ء)
۳۔ فقیہ النفس فقہاء کی ایک اصطلاح ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فقہ میں کثرت ممارست کے بعد ایک ایسا ذوق سلیم عطا فرمایا ہو، جس کی روشنی میں وہ کتابوں کی مراجعت کے بغیر بھی صحیح نتیجے تک پہنچ سکتا ہو۔ ''میرے والد میرے شیخ'' تالیف: مولانا محمد تقی عثمانی صاحب ص:۵۸ (دہلی ۱۹۹۵ء)
اس کے بعد مولانا محمد تقی عثمانی جیسے بڑے فقیہ اور جلیل القدر عالم نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ:
''مجھ جیسے بے علم و عمل شخص کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ کسی بارے میں فقیہ النفس ہونے کا فیصلہ کرے کیونکہ فقیہ النفس کی پہچان بھی انہی لوگوں کا حصہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تبحر علمی سے نوازا ہو، چنانچہ اس پہچان کے لیے بھی حضرت علامہ انور شاہ کشمیری جیسے انسان کو ضرورت ہے۔'' (میرے والد میرے شیخ، ص:۵۸)
مگر آج کل اور اسلامی اصطلاحات و خطابات کی طرح اس لفظ فقیہ النفس کی حرمت بھی پامال ہو رہی ہے، ہند و پاکستان میں غالی معتقدین جن میں شاید بعض کو اس کے معنی بھی معلوم نہ ہونگے اپنے ممدوحین کے لیے اسکا بار بار اور کثرت سے استعمال کرتے رہتے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون، انوری (مجموعہ افادات ملفوظات علامہ انور شاہ کشمیریؒ) تالیف: مولانا محمد انوری ص:۵۰ (دلائل پور ۱۳۸۷ھ) نفحۃ العنبر فی حیات امام العصر الشیخ انور۔ تالیف: مولانا محمد یوسف بنوری، ص ۱۸۴ (کراچی ۱۳۸۹ھ)
۴۔ کئی کتابوں میں یہ ۱۳۲۳ھ لکھا ہوا ہے جو صحیح نہیں، صحیح تاریخ وہ ہے جو یہاں نقل کی گئی ہے، ملاحظہ ہو:
''الکہف والرقیم فی ملخص رحلۃ المصلح العظیم'' مرتبہ مولانا عبدالحق حقی اعظمی۔ (علیگڑھ ۱۹۱۲ء)
۵۔ نفحۃ العنبر ص:۷۷، نیز ماہنامہ بینات کراچی، مولانا محمد یوسف بنوری نمبر ص:۱۲۰۔
۶۔ ضیاء القلوب ص:۹۰ عکس طبع اول (مجتبائی دہلی ۱۲۸۴ھ)
۷۔ مکتوب، مکتوبہ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ مکتوبات اکابر دیوبند ص:۲۸-۲۷ (دیوبند ۱۹۸۰ء)
۸۔ ''دہلی اور اس کے اطراف'' مولانا عبدالحی ص:۱۳۷ (طبع اول دہلی ۱۹۵۸ء)